

رضنا علی عابدی

ایک قطار کی کہانی

لمبی قطار دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ اُف میرے خدا، اتنی لمبی قطار؟ یہ اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آگئے؟ کیا ان سب کو آج ہی آنا تھا؟ کیا آنے کے لیے کوئی اور دن نہیں بچا تھا؟ کیا اتنی بڑی دنیا میں کوئی اور کام نہیں تھا؟۔ میں یہ سوچتا گیا اور قطار کے آخری سرے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ جو ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے لگا کھڑا تھا، مسلسل گا رہا تھا اور کھڑکی کے نچلے تختے پر طبلہ بجا تا جا رہا تھا۔ وہ جو اُس کے پیچھے کھڑا تھا، اس نے اپنی ٹوپی ذرا سی ترچھی کر لی تھی اور آگے والا جب گاتے گاتے رک جاتا تھا تو پیچھے والا اپنے منہ سے ساز بجانے لگتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ایک ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ذرا ذرا دیر بعد ایک ہی کنگھے سے دونوں اپنے بال درست کرتے تھے۔

ان کے پیچھے کھڑا تیسرا آدمی مسکرائے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ بلا سبب مسکرا رہا ہے مگر پھر خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی سبب ہوگا ضرور۔

چوتھے آدمی نے گلے میں سرخ رومال باندھ رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رومال کھولتا، اس سے اپنے چہرے پر پنکھا جھلتا اور رومال دوبارہ باندھتا اور سامنے والے فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی ہوئی لڑکی کو اس آدا سے دیکھتا جیسے وہ ابھی اُتر کر آئے گی اور آکر اس سے کہے گی کہ یہاں تپتی دھوپ میں کھڑے کیا کر رہے ہو، میرے ٹھنڈے ٹھنڈے فلیٹ میں چلو۔ اور وہ آگے کھڑے ہوئے تین آدمیوں کو ناز و ادا سے اور پیچھے کھڑے ہوئے دس آدمیوں کو حقارت سے دیکھتا ہوا لڑکی کا ہاتھ تھامے چلا جائے گا۔

پانچواں شخص دھوپ کا چشمہ لگا کر آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ سب کو دیکھ رہا ہے اور اُسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے، لہذا وہ اپنے بدن کو جہاں تہاں کُھجائے جا رہا تھا اور کچھ تو اُس کھجانے کی لذت سے خوش تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اُسے ٹکٹ ضرور ملے گا۔

اس کے پیچھے جو شخص کھڑا تھا اسے میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ غالباً یہ

راشن کارڈ بنانے والا وہی کلرک تھا جو بائیں ہاتھ سے لکھا کرتا تھا اور دفتر میں ہمیشہ جوتے اتار کر بیٹھتا تھا، راشن کارڈ بنوانے والوں کی قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کو دھتکارا کرتا تھا مگر اُس روز خود قطار میں کھڑا تھا اور بڑا مسرور نظر آتا تھا کہ وہ چھٹے نمبر پر کھڑا ہے۔

جو لوگ قطار کے درمیان تھے، ان کے بارے میں طے کرنا مشکل تھا کہ کیا سوچ رہے تھے۔ کچھ گنگنا رہے تھے، کچھ گھر سے چلغوزے لے آئے تھے، کچھ کھڑے ربڑ کی چپلوں کے فائدوں اور نقصانات پر بحث کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ انہیں پہنے پہنے چاہو نہر میں اتر جاؤ، چاہے مندر میں چلے جاؤ۔ دوسرے کا اصرار تھا کہ پیروں میں پسینہ بہت آتا ہے۔ تیسرا خدا جانے کہاں سے سن کر آیا تھا کہ ربڑ کی چپلیں پہننے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔ چوتھا ان چپلوں کا سخت مخلف تھا کیوں کہ وہ ایک روز ایسی ہی چپلیں پہن کر اپنی محبوبہ سے ملنے چلا گیا تھا تو اُس نے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ربڑ کی چپلیں پہنے ہو تو وہ اپنے شوپر کو بھی قریب نہیں آنے دیتی۔

ان لوگوں سے پیچھے بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتے کرتے ان کے چشموں کے شیشے دھندلا گئے تھے۔ ان سب نے جوتوں کے پچھلے حصے کو ایڑیوں سے دبا دبا کر چپل بنا لیا تھا اور پتلونوں میں نیفے ڈلوا کر انہیں ازار بندوں سے باندھ رکھا تھا۔ بال رنگوائے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا اور بالوں کی جڑیں سفید سے بھی زیادہ سفید نظر آتی تھیں۔ ان سب کی پان کی ڈبیوں کی قلعی اُڑ چکی تھی اور ان میں سے کسی کو غرض نہیں تھی کہ سامنے والے فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی ہوئی لڑکی نے کتنی اونچی اسکرٹ پہن رکھی ہے اور یہ کہ اس کی پنڈلیاں جتنی سیاہ ہیں رانیں اتنی کالی نہیں۔

بزرگوں سے پیچھے جو لوگ کھڑے تھے ان کا کام ذرا مشکل تھا۔ وہ بار بار گردنیں نکال نکال کر اپنے سے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کو گن رہے تھے۔ خدا جانے وہ بار بار کیوں گنتے تھے۔ شاید انہیں خیال تھا کہ ان کی آنکھ بچے گی تو کچھ نئے لوگ خاموشی سے آکر ان سے آگے کھڑے ہو جائیں گے۔ ان کی گردنیں لمبی ہوئی جا رہی تھیں اور بہت زیادہ دھیان دیتے دیتے آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ شاید یہ لوگ ٹکٹ پانے اور محروم رہ جانے والوں کی درمیانی سرحد پر کھڑے تھے۔ ان کا حال سُنار کے ترازو جیسا تھا کہ ایک پلڑے میں

سوکھا پتہ بھی گرے تو ترازو جھک جائے۔

آخر ان کی چوکسی کام آئی۔ لال رومال والے کا کوئی دوست کہیں سے آکر اس سے باتیں کرنے لگا اور باتیں کرتے کرتے اور سرکتے سرکتے قریب تھا کہ قطار میں شامل ہو جائے کہ پوری ٹولی چلائی۔ اتنے بہت سے لوگ ایک ساتھ بولے تو محض چند لفظ سمجھ میں آئے: اے ... بے ایمان ... کہاں سے ... سالے ... اور تیری۔

رومال والے کا دوست گھبرا کر قطار سے نکل گیا اور سٹیپٹا کر لپکا۔ مجھے اُس پر کچھ ترس آیا اور کچھ پیار بھی آیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہ اب جھینپتا ہوا آئے گا اور قطار کے آخر میں میرے پیچھے کھڑا ہو جائے گا۔ مگر اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے دیکھ نہ رہا ہو۔ لپک کر سائیکل رکشا رُکوا یا، اس میں بیٹھا اور چلا گیا۔

اس ٹولی سے پیچھے جو لوگ کھڑے تھے ان کا کام آسان تھا۔ وہ بار بار اپنے سے پیچھے والوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے بہت سوچا۔ اپنی عقل پر بہت زور دیا۔ جتنے اسباب ہوسکتے تھے، ایک ایک کر کے ہر ایک پر دماغ سوزی کی پر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اپنے سے پیچھے والوں کو کیوں دیکھ رہے ہیں۔ بہت سوچا مگر میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ غور کر کے میں نے اپنا بُرا حال کر لیا۔ میں نڈھال ہو گیا اور میرے سارے اعضا شل ہونے لگے۔ بازوؤں کا درد اتر کر ہتھیلیوں میں آگیا۔ دل کی دھڑکن اپنے ہی کانوں میں سنائی دینے لگی اور کنپٹیوں کی تپک آنکھوں میں دکھائی دینے لگی۔ یہ لوگ پیچھے والوں کو کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یہ سوال میرے کاسے سر کے اندر یوں گونجنے لگا جیسے مصر کے اہرام کھوکھلے ہو جائیں اور فرعونوں کی میتیں مڑ مڑ کے پیچھے دیکھنے لگیں۔

آج بہت عرصے بعد سمجھ میں آیا ہے کہ میں یہ سب کچھ سوچ کر کوئی دوسری سوچ مٹانا چاہ رہا تھا۔ خود میں نے بھی کئی بار مڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور دیکھا تھا کہ اب قطار میں کوئی بھی نیا آدمی نہیں آ رہا ہے۔ بہت دیر سے کھڑا آخری آدمی میں ہی ہوں اور مایوسی میں میرا سا جھے دار شاید کوئی نہیں۔